ڈاکٹر عبادت بریلوی

اُردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش

اُردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس میں ہمیشہ مختلف زبانوں کے الفاظ داخل ہوتے رہے اور ان الفاظ نے وقت کے ساتھ ساتھ اس زبان کے نظام میں اپنی ایک مستقل جگہ بنا لی ہے۔ چنانچہ آج اردو زبان کی جو تصویر ہمیں نظر آتی ہے اس میں مختلف زبانوں کے ان الفاظ کے بے شمار رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ اور اگر ان الفاظ کے مختلف رنگوں کو اس تصویر سے نکال لیا جائے تو یہ تصویر بھی باقی نہیں رہے گی۔ اس کی اصل، اس میں شبہ نہیں کہ ہندی بھاشا ہے اور اسی بولی کے افعال پر اس کی بنیاد قائم ہے لیکن اس زبان نے تاریخی تقاضوں کو اس طرح پورا کیا ہے کہ گزشتہ کئی سو سال میں اس نے ان تمام اثرات کو قبول کر کے جو اس برِ صغیر پر پڑتے رہے اپنی شکل اس طرح بدلی کہ ہندی اور بھاشا کا اس میں بہت کم اثر نظر آتا ہے۔ اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اپنے ارتقائی سفر میں اس نے فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی کے بے شمار الفاظ کو اپنے اندر داخل کیا اور ان کی شکل کو اس نے اپنے مخصوص سانچے میں ڈھال لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اُن زبانوں کے وہ تمام الفاظ جو اُردو کو ایک خاص شکل دیتے ہیں اس کی یہ شکل نہیں بنا سکتے۔ اُردو کا مزاج یہ ہے کہ وہ اجنبی اور نامانوس الفاظ کو اپنے رنگ میں اس طرح رنگتی ہے کہ وہ دوسری زبان کے الفاظ معلوم نہیں ہوتے بلکہ اُردو کے الفاظ بن جاتے ہیں۔ اس کا استعمال، اس کے تلفّظ، اس کے رنگ و آہنگ، اس کے قواعد، غرض ہر چیز اردو کے سانچے میں ڈھلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ زبان ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس کے اس مزاج کو سامنے رکھے بغیر اس کے نظام کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو زبان نے فارسی زبان کی عظیم روایات کے زیرِ اثر ترقی کی اَن گنت منزلیں طے کیں۔ یہی سبب ہے کہ اس زبان میں فارسی کے الفاظ بیشمار نظر آتے ہیں۔ عربی کے الفاظ براہِ راست

اُردو زبان میں کم داخل ہوئے، لیکن فارسی کے توسط سے وہ ضرور اس زبان میں آئے اور ان میں سب نے اپنی شکل کچھ ایسی بدلی کہ وہ اُردو زبان کے الفاظ بن گئے۔ اس صورت حال نے اُردو زبان میں روایت قائم کر دی کہ وہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو اپنے نظام میں داخل کرے اور ان کو اپنے سانچے میں ڈھالے۔ یہی وجہ ہے کہ اس برِصغیر میں جتنے لوگ بھی باہر سے آئے اور اپنی اپنی زبانوں کو ساتھ لائے، ان سب کے الفاظ اُردو زبان میں داخل ہوتے چلے گئے۔

جب مغرب سے مختلف قومیں اس برصغیر میں تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوئیں تو سات سمندر پار سے آئے ہوئے ان لوگوں کی زبان کے الفاظ بھی اُردو زبان کا جز بننے لگے۔ ان میں پرتگالی، فرانسیسی اور انگریزی زبان کے الفاظ اس زبان میں اس طرح داخل ہوئے کہ اس زبان کے بولنے والوں اور اس کے علمبرداروں نے کبھی اس کو سوچا بھی نہیں کہ وہ کس زبان کے الفاظ ہیں۔ مثلاً قمیص کا لفظ ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قمیص کا لفظ ہماری مشرقی زبانوں میں سے لیا ہوا لفظ ہے لیکن درحقیقت یہ پرتگالی لفظ ہے جس کو (KAMEZ) کہتے ہیں۔ لیکن یہ لفظ اردو زبان میں آگیا اور ہم اس کو بالکل اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح اپنی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور لفظ کوٹھی ہے۔ اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ "کوٹھی" لفظ ہندی کا کوئی لفظ ہے اور ہماری زبان میں اسی وجہ سے بہت عام ہے۔ ہر شخص ایک اچھے مکان کو کوٹھی کہتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوٹھی بھی ایک پرتگالی لفظ ہے اور کوٹھی اس مکان کو کہا کرتے تھے جس میں باہر سے آئے ہوئے پرتگالی تاجر اپنا مال بھی رکھتے تھے اور اس میں قیام بھی کرتے تھے وقت کے ساتھ ساتھ کوٹھی کا یہ لفظ ہماری اردو زبان میں مغربی طرز کے اس مکان کے لیے استعمال ہونے لگا جو کشادہ اور خوبصورت ہو۔ غرض اس طرح نہ صرف پرتگالی بلکہ دوسری مغربی زبانوں کے بے شمار الفاظ اردو زبان میں داخل ہوتے چلے گئے اور کسی کو اس بات کا احساس بھی نہ ہوا کہ یہ الفاظ کس طرح ہماری زبان میں آرہے ہیں اور کیا صورت اختیار کر رہے ہیں۔ بولنے والے اور لکھنے والے اسی طرح ان کو بولتے اور لکھتے رہے جیسے وہ ان کی زبان کے الفاظ ہیں۔

برعظیم پاک و ہند کی تاریخ اس بات کو بتاتی ہے کہ پرتگالیوں کا اثر اس سرزمین پر زیادہ [illegible]

نے اس ملک میں اپنی زندگی کا آغاز تاجروں کی حیثیت سے کیا لیکن بالآخر یہاں کی سیاست میں حصہ لینے لگے اور یہاں کے حکمران بن بیٹھے اس لیے ان کا اثر ظاہر ہے کہ برعظیم پاک و ہند کی تہذیب و ثقافت پر بہت گہرا ہوا۔ انھوں نے کئی سو سال تک اس ملک کے مختلف حصوں پر باقاعدہ حکومت کی اور یہاں کے نظامِ تعلیم، معاشرت، تہذیب، فکر و فلسفہ اور شعر و ادب، غرض تمام شعبوں کو متاثر کیا اور ان کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے لباس، رہن سہن، سوچنے اور غور کرنے کے انداز میں، محسوس کرنے کے طور طریقوں میں بھی ان کے اثرات کسی نہ کسی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس سے چشم پوشی کرنا درحقیقت ایک تاریخی حقیقت کو نظر انداز کرنا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں نے انگریزوں کے مقابلے میں سپر ڈال دی۔ ان کی آخری کوشش انگریزوں کو اس ملک سے باہر نکالنے کی ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد جب انگریزی تسلط ہوا اور انگریزوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہو گئی تب بھی انگریزوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھا اور کبھی ان پر بھروسہ نہیں کیا۔ مسلمانوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ ظاہری سطح پر کچھ مطابقت پیدا کر لی، کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہیں تھا، لیکن دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ایک غبار رہا جس نے گزشتہ سو سال میں کبھی کبھی سیاسی میدان میں آندھیوں کی شکل بھی اختیار کی۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو اس ابتلا کے دور میں نئی راہیں دکھائیں اور انگریزوں کے ساتھ مطابقت اس لیے پیدا کی کہ ایک طرف تو وہ شبہات دور ہو جائیں، جو انگریزوں کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے تھے اور دوسرے اس وجہ سے کہ برادرانِ وطن اس وقت سے بہت پہلے انگریزوں کے ساتھ باقاعدہ مطابقت پیدا کر چکے تھے۔ سر سید احمد خاں کی دوربین نظروں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ مسلمان اس دوڑ میں بہت پیچھے ہیں جو اس برعظیم میں مختلف قوموں کے درمیان شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ سر سید نے مسلمانوں کو انگریزوں سے قریب لانے کی اپنی سی پوری کوشش کی۔ اس کا اثر بھی ہوا۔ معاشرت، تہذیب، ثقافت، نظامِ فکر، عقاید، ان تمام چیزوں میں اس کے اثرات نظر آتے ہیں۔ خود سر سید کی اصلاحی تحریک ان اثرات کا آئینہ ہے۔ مسلمانوں کو سر سید کی اس تحریک سے جو فائدے پہنچے اس کی تفصیل

یہاں دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ سرسید کے زمانے میں بھی کچھ لوگ مسلمانوں میں ایسے موجود تھے جو کسی سطح پر انگریزوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے تیار نہ تھے اور ان لوگوں کا اثر بھی مسلمانوں کی ثقافتی زندگی پر پڑا۔ ظاہر ہے کہ سرسید ان لوگوں کے مقابلے میں اپنی قوم کی رہنمائی کا کام زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتے تھے۔

سرسید احمد خان نے مغرب کا اثر قبول کیا اور انگریزوں سے مطابقت پیدا کرنے کی طرف توجہ بھی دلائی لیکن یہ تصوّر کر لینا بہت بڑی غلطی ہے کہ سرسید اپنے زمانے میں انگریزوں کی تہذیب، ثقافت اور زبان و ادب سے مرعوب تھے۔ ایسا نہیں تھا۔ وہ اپنی لسانی، ادبی، تہذیبی اور معاشرتی روایات کا گہرا شعور رکھتے تھے اور یہی سبب ہے کہ ان کی تحریک میں بڑی صحتمندی نظر آتی ہے۔ اور اس کے اثرات مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں بہت گہرے اور دیرپا دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس میں مغرب اور خصوصاً انگریزوں کے اثرات ہمارے نظام پر وقت کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ خود سرسید کے زمانے میں اور ان کے بعد، انگریزوں کا اثر پڑا بلکہ بعض اوقات تو ایسی کیفیت نظر آتی ہے کہ ان اثرات میں سطحیت کے اثرات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مثلاً خود سرسید کے ہم عصروں میں بعض اہم لکھنے والوں نے اپنی تحریر، اور تقریر دونوں میں انگریزی کے الفاظ کو استعمال کیا۔ ان تحریروں اور تقریروں میں ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کے متبادل اُردو زبان میں آسانی سے مل سکتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کے اثر کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ حالیؔ اور نذیر احمد ایسے بڑے اور اہم لکھنے والے بھی اس سے نہیں بچ سکے۔ حالیؔ کی مختلف تحریروں میں بعض اوقات انگریزی کے ایسے بعض الفاظ آتے ہیں جو ہمیں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کم و بیش یہی حال نذیر احمد کا بھی ہے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حالیؔ اور نذیر احمد نے شعوری طور پر انگریزی کے اجنبی اور نامانوس الفاظ استعمال نہیں کیے۔ حالات کچھ ایسے تھے جس کی وجہ سے وہ ایسا کرنے کے لیے مجبور ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان الفاظ کو اردو زبان میں کوئی ایسی جگہ نہ دے سکے جو ان کے شایانِ شان ہے۔

سرسید کے بعد کا دَور خاص طور پر بیسویں صدی کا زمانہ، اردو زبان اور ادب کی ترقی کا زمانہ ہے اور اس زمانے میں اس زبان اور ادب نے اپنے دامن میں بہت سی وسعتیں پیدا کیں۔ یہی زمانہ ہے جب مغرب کے اثر سے برعظیم کی زندگی میں ایک انقلابی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ صنعتیں قائم ہوئی ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں کام ہوا ہے اور اس طرح زندگی اپنے محدود دائرے میں رہ کر ان رکاوٹوں کے باوجود جو انگریزوں نے پیدا کر رکھی تھیں، آگے کی طرف بڑھی۔ اس صورتِ حال نے زبان کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ جو چیزیں اس انقلابی تبدیلی کے زیر اثر برصغیر میں آتی ہیں ان کے لیے انگریزی کے الفاظ اس طرح فطری انداز میں داخل ہوئے ہیں کہ ان کے اجنبی اور نامانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ریل کا نظام شروع ہوا تو ریل، ریلوے لائن، اسٹیشن، سگنل، اسٹیشن ماسٹر، ٹکٹ کلکٹر، فورمین، چارج مین، انجن، ٹکٹ چیکر، اس طرح کے بے شمار الفاظ اردو زبان میں داخل ہو گئے اور کسی نے اس کا احساس بھی نہ کیا کہ ان الفاظ کا متبادل اردو لفظ کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے۔

تقریباً ایک صدی سے یہ الفاظ اردو زبان میں رائج ہیں اور اب اس زبان کے مزاج کا جزو بن چکے ہیں، ان کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب سائنس کی روشنی اس برصغیر میں بھی پھیلنے لگی تو ہر چند کہ وہ محدود تھی اور انگریزوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر اس کو محدود کر رکھا تھا اس وجہ سے کہ وہ اس برصغیر کے لوگوں کو اس میدان میں بڑھنے دینا نہیں چاہتے تھے لیکن فطرت کے قانون کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ ترقی کی رفتار محدود ہو سکتی ہے، اسے خاص وقت تک روکا جا سکتا ہے، لیکن اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ ہوا کہ سائنس کے مختلف شعبے جب اس برصغیر پہ اپنا جادو جگانے لگے تو بے شمار الفاظ ایسے اس زبان میں داخل ہوئے جن کی اصل انگریزی یا کوئی اور مغربی زبان تھی لیکن وہ اس زبان کے مزاج کا جز بن گئے مثلاً تھرمامیٹر، ایکس رے، ڈاکٹر، انجینئر، مشین، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، ٹیلیگرام، غرض اس طرح کے بے شمار الفاظ اردو زبان میں آ گئے۔ اور اگرچہ ان میں سے بعض کے اُردو ترجمے بھی لوگوں نے کیے اور وہ ترجمے رائج بھی ہو گئے، لیکن انگریزی کے یہ الفاظ اس زبان میں اس طرح استعمال ہوتے رہے جیسے یہ اسی زبان کے الفاظ ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں انگریزی کے جو مختلف الفاظ اس طرح آئے ہیں۔ اس کی یہ صرف چند مثالیں ہیں جن

لوگوں کو لسانیات سے دلچسپی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انجینئرنگ کا کوئی شعبہ ان الفاظ سے خالی نہیں اور ان الفاظ کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں تک پہنچ گئی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے ارتقا میں ایک فطری آہنگ موجود ہے۔ انسان کی کوششیں اور کاوشیں اس کے رُخ کو کسی حد تک بدل تو سکتی ہیں لیکن اس کے راستے کو روک نہیں سکتیں۔ یہی صورتِ حال اردو زبان کے ارتقا میں بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ یہ تبدیلیاں جن کا ابھی ذکر ہوا، دراصل بالکل فطری انداز میں ہماری زبان میں پیدا ہوئیں اور اسی لیے ان میں ہم کو اجنبیت اور ناموانست کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب اس طرح کا ماحول پیدا ہوتا ہو تو بعض لوگ ان اثرات کو اپنی زندگی پر اس طرح مسلط کر لیتے ہیں کہ ان کی صورت مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ ہماری قوم کے افراد گذشتہ سو سال میں اس دوسری صورتِ حال سے بھی دوچار ہوئے۔ چنانچہ انگریزوں کے اثر سے بعض اوقات ہمارے لباس، رہن سہن، اندازِ گفتگو، لب و لہجہ کی جو کیفیت پیدا ہوئی ہے وہ بڑی حد تک مضحکہ خیز ہے۔ آج بھی جب کہ ہم ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری ہیں، اور آج بھی جب ہم اپنی تہذیب و ثقافت کے جگر لخت لخت کو جمع کر رہے ہیں، ہمارے ہاں ایسے افراد بھی مل جائیں گے جو نہ صرف اپنی زبان، تحریر اور تقریر میں انگریزی زبان کے نامانوس اور اجنبی الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، بلکہ ان کا لب و لہجہ اور طرزِ گفتگو بھی ایسا ہے جس میں انگریزی لب و لہجہ اور طرزِ گفت گو کی جھلک نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کو تہذیب اور ثقافتی روایت میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جا سکتی اور زبان بھی ان کی اس روایت سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ ایسے لوگ چونکہ سطحی قسم کے ہوتے ہیں اس لیے لسانی، معاشرتی اور تہذیبی روایات پر وہ کوئی خاص اثر نہیں چھوڑتے۔ دراصل ان کا عمل نقالی کا عمل ہوتا ہے۔ وہ فیشن کے بندے ہوتے ہیں اُن کی بنیاد تہذیبی اور ثقافتی روایات پر استوار نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عمل میں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ وہ فیشن کے بندے ہوتے ہیں اور فیشن کے طور پر بعض ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو ہمارے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں۔

یہ صورتِ حال جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، ادب اور تنقید تک میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ ہمارے

ادب و تنقید پر گزشتہ نصف صدی میں ایسے دور بھی گزرے ہیں جب نہ صرف انگریزی کے نامانوس الفاظ، بلکہ بڑے بڑے جملے اور اقتباسات بھی، ہمارے بعض لکھنے والوں نے اس طرح اپنی تحریروں کے درمیان کھپائے کہ ان کو دیکھ کر ہمارا احساسِ جمال تلملا جاتا ہے۔

انگریزی کی ادبی اور تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس زمانے میں ہمارے لکھنے والے انگریزی سے اتنے مرعوب تھے کہ انگریزی کے خیالات اور انگریزی کے جمالیاتی اقدار تک کو معیار سمجھ کر اپنے ادب اور تنقید میں استعمال کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ زبان ایسی صورتِ حال سے بچ نہیں سکتی۔ چنانچہ اس پر بھی اثر ہوا اور ہماری ادبی اور تنقیدی تحریروں میں انگریزی کے بے شمار الفاظ، فقرے، جملے بلکہ پیراگراف تک نظر آنے لگے لیکن اردو زبان کے لسانی اور ادبی نظام نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب اپنی موت آپ مر گئے۔

البتہ ادب و تنقید اور جمالیات کے ایسے الفاظ و اصطلاحات ضرور اردو زبان میں استعمال ہوئے اور انھوں نے اپنی جگہ بنالی جن کے متبادل الفاظ اس میں موجود تو تھے لیکن جن کے ساتھ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو ایک وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے مقابلے میں اردو، عربی یا فارسی کے متبادل الفاظ یا اصطلاحات اردو زبان اور ادب کے طالب علموں کے لیے اجنبی اور نامانوس تھے۔ مثلاً ایمیجری کی اصطلاح تنقیدی اردو میں استعمال ہونے لگی، حالانکہ اس کا ترجمہ تصویر کاری پیکر تراشی بھی ہو سکتا تھا۔ بعض نقادوں نے ان دونوں اصطلاحوں کو استعمال کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ایمیجری کا صحیح مفہوم ان الفاظ سے واضح نہ ہو سکا۔ اس قبیل کے کچھ اور الفاظ بھی مل جائیں گے جن کو ہمارے ادیبوں اور نقادوں نے استعمال کیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ بے شمار ادبی تنقیدی اور جمالیاتی اصطلاحات کے اردو مترادفات بھی ہمارے لکھنے والوں نے استعمال کرنے شروع کیے اور یہ سب آج اردو زبان کا سرمایہ ہے۔

علمی اصطلاحات کا مسئلہ بھی اس سلسلہ میں خاص طور پر سامنے رکھنے کے قابل ہے۔ کسی زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ سب سے زیادہ توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ اردو میں بھی ایسا ہی ہوا، اور اس زبان کو بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ جب علوم نے ترقی کی اور ان میں تدریس کا کام علمی و تعلیمی اداروں میں رائج ہوا تو علمی اصطلاحات کی ضرورت پیش آئی۔ ترجمے کے لیے اردو والوں نے

فارسی اور عربی کی طرف رجوع کیا اور علمی اصطلاحات کے بے شمار ترجمے کر ڈالے لیکن ان میں سے کچھ ہی عام ہوتے اور اس کا سبب یہ ہے کہ عربی اور فارسی کے مقابلے میں تقریباً ایک صدی کا زمانہ ایسا گزرا جب ہمارے نوجوان انگریزی کی روایت سے زیادہ قریب رہے۔ اس لیے انگریزی کی اصطلاحات ان کے لئے زیادہ نامانوس اور اجنبی نہیں رہیں۔ اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو جامعۂ عثمانیہ میں اصطلاحات کے جو ترجمے ہوئے تھے وہ سب رائج ہو گئے ہوتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آج بھی علوم کی دنیا میں انگریزی کی علمی اصطلاحات ہمارے نوجوان زیادہ آسانی سے استعمال کرتے ہیں۔ اور اصطلاحات کے مسئلے کا حل شاید یہی ہے کہ ہم ایسی تمام انگریزی کی علمی اصطلاحات اپنی زبان میں داخل کر لیں جو آج ہمارے لیے اجنبی اور نامانوس نہیں ہیں اور جن سے ہمیں آئے دن واسطہ پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے ان میں سے بعض اصطلاحات جو رائج کی جائیں وہ ہماری زبان کا ساتھ نہ دے سکیں اور ان کے ترجمے عام ہو جائیں۔

آج کل انگریزی کے الفاظ کا استعمال ہماری زبان میں بھونڈے طریقے پر بھی ہو رہا ہے اس میں ادبی زبان، تحریر و تقریر اور عام گفتگو سبھی کچھ شامل ہے۔ دراصل انگریزی ہمارے مزاجوں میں اس حد تک داخل ہو چکی ہے کہ ہم خود بغیر کوشش کے غیر شعوری طور پر بعض ایسے الفاظ روانی سے استعمال کرتے چلے جاتے ہیں جن کے استعمال پر اگر غور کیا جائے تو خود استعمال کرنے والوں کو اچھا نہیں معلوم ہو گا۔ اس کے لیے ان لوگوں کو مجرم نہیں کہا جا سکتا جو ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ انگریزی چھاپ ہمارے نظام پر بڑی گہری ہے لیکن اس صورت حال کو بڑی حد تک ختم کیا جا سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ ان لوگوں کو زبان کی اہمیت اور اس کے مزاج کی کیفیت کا احساس دلایا جائے۔ یہ کام ایک منصوبے کے تحت جب تک نہیں ہو گا خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے سب سے پہلے نظام تعلیم کے ابتدائی مدارج کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے گھروں کے ماحول کو درست کرنا لازمی ہے۔ جب تک بچے کو یہ احساس نہ دلایا جائے گا کہ زبان اپنا ایک نظام رکھتی ہے اور اس میں حسن کی بہت سی اقدار ہوتی ہیں اس وقت تک اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مشکل تو یہی ہے کہ ہمارے گھروں میں اس بات کا شعور نہیں ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور اس کا نتیجہ یہ ہے

کہ ہمارے یہ بچے بڑھ کر جب جوان ہوتے ہیں تو ان کی تحریر و تقریر میں انگریزی الفاظ کی خاصی فراوانی نظر آتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ زبان کا ارتقا فطری ہوتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا کہ انسان کی کوششیں اور کاوشیں اس ارتقائی کیفیت میں زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہیں۔ اردو زبان آج اس کوشش اور کاوش کے لیے چشم براہ ہے۔

یادگارِ شبلی

(از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام)

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کو ہمارے ادب اور علمی و فکری تاریخ میں جو بلند مقام حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے احوالِ زندگی سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۴۲ء میں حیاتِ شبلی میں جمع کیے تھے۔ تصانیف کے بارے میں وہ ایک علیحدہ کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر محمد اکرام کی اس کتاب یادگارِ شبلی میں نہ صرف مکمل حالاتِ زندگی ہیں (اور اس ضمن میں وہ مواد سمیٹ لیا گیا ہے جو حیاتِ شبلی کی اشاعت کے بعد شائع ہوا یا سید صاحب کو کسی وجہ سے دستیاب نہ ہو سکا) بلکہ علامہ شبلی کی ہر اہم کتاب پر علیحدہ تفصیلی تبصرہ شامل ہے۔

علامہ شبلی ایک جامع حیثیات ہستی تھے۔ وہ بیک وقت اعلیٰ درجے کے مصنف، معلم، مورخ، شاعر اور سیاست دان تھے۔ انھوں نے سولہ برس علی گڑھ کالج میں سرسید کے دستِ راست کی حیثیت سے گزارے اور علی گڑھ تحریک کے رکن رکین رہے لیکن وہ ندوۃ العلماء کے بھی "جزوِ غالب" تھے اور علما کی تنظیم اور قدیم کی پاسداری کے لیے عمر بھر سرگرم عمل رہے۔ قدیم و جدید کی نسبت ان کا طریقہ خذ ما صفا و دع ما کدر کا تھا اور انھوں نے ان دونوں میں سے بیچ کی راہ ڈھونڈنے کی کوشش۔

یادگارِ شبلی اس جامع حیثیات ہستی کی زندگی، کارناموں اور تصانیف کے طویل اور غائر مطالعہ کا ماحصل ہے۔ انشاء اللہ اس سے نہ صرف شبلی شناسی کی نئی راہیں کھلیں گی بلکہ قوم کے فکری مسائل سمجھنے اور ان کا مناسب حل تلاش کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ ضخامت ۴۶۸ صفحات۔ قیمت:۔ ۱۴/- روپے

ملنے کا پتہ :۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور